اپنی تربیت آپ

خرم مرادؒ

تربیت کا عمل انسان کے پیدا ہوتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ تربیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے جو خود بخود ہو جاتی ہے‘ جب کہ کچھ تربیت انسان اپنی کوشش سے کرتا ہے۔ تربیت کے معنی کسی چیز کو نشو ونما دینا‘ بڑھانا اور تقویت دینا ہے۔ تربیت سے ملتا جلتا ایک اور لفظ بھی استعمال ہوتا ہے‘ وہ ہے تزکیہ۔ اس میں پاکیزہ کرنا اور نشو ونما دینا‘ دونوں معنی شامل ہیں۔ انسان کے پیدا ہوتے ہی اس کی تربیت کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اُس کا جسم بڑھنا شروع کرتا ہے۔ آیندہ زندگی میں درپیش مراحل کے لیے مختلف صلاحیتیں اور استعداد بتدریج پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

کچھ کام انسان دوسروں کو دیکھ کر اور ان سے سیکھ کر اختیار کرتا ہے‘ جیسے چلنا پھرنا‘ کھانا پینا‘ کپڑے پہننا وغیرہ۔ یہ سب کام آدمی سیکھتا ہے‘ یعنی ان کی تربیت حاصل کرتا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ نوالہ کیسے بنانا ہے‘ کپڑے کیسے پہننے ہیں‘ یہ سب کچھ وہ دوسروں کو دیکھ کر یا کسی کے سکھانے سے سیکھتا ہے۔ زبان بڑی اہم چیز ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ تربیت کا معجزہ ہے کہ بچہ تین چار سال کی عمر تک ایک زبان سیکھ لیتا ہے اور اس طرح سیکھتا ہے کہ اس کی گرامر بھی صحیح ہوتی ہے‘ لغت بھی اور محاورہ بھی۔ اگرچہ اس نے گرامر کی کوئی کتاب نہیں پڑھی ہوتی‘ کوئی لغت نہیں دیکھی ہوتی‘ کسی اسکول میں داخلہ نہیں لیا ہوتا‘ وہ کوئی کتابیں نہیں پڑھتا‘ مگر پھر بھی زبان سیکھ جاتا ہے۔ اگرچہ کسی زبان کو بڑی عمر میں بھی سیکھنا آسان نہیں ہوتا۔

یہ تربیت کے لیے قدرت کے انتظامات ہیں۔

قدرتی تربیت کے ساتھ ساتھ بعض چیزیں اور مہارتیں بھی ضروری ہیں۔ البتہ ہمیں وہ تربیت مطلوب ہے جو ہماری سوچ' عمل' اخلاق اور کردار کو اس سانچے میں ڈھال دے جس کے ذریعے ہم اللہ کی رضا حاصل کرسکیں۔ ہم سب اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑھ کر جو چیز محبوب ہے وہ اس کی راہ میں جہاد اور اس کے دین کو قائم کرنے کے لیے جدوجہد ہے۔ اس نے اپنی محبت اور اپنے رسولؐ کی محبت کو اپنی راہ میں جہاد کے ساتھ منسلک کیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دین میں چوٹی کا عمل' جہاد ہے۔ اس بات کی اہمیت کے پیش نظر ہی ہم سب ایک تنظیم میں شامل ہوئے ہیں اور ایک جماعتی اور اجتماعی زندگی اختیار کی ہے۔ اس اجتماعیت کا تقاضا ہے کہ تربیت کے عمل میں ہمارے پیش نظر سب سے بڑھ کر یہی امر ہونا چاہیے کہ ہم دین کو قائم کرنے کے لیے جہاد کے اہل بنیں۔

تربیت کی بنیاد: ارادہ و عزم

انسان کی تربیت قدرتی بھی ہوتی ہے اور گردوپیش کے حالات و مشاہدات سے بھی' دوسروں سے سیکھ کر بھی اور لکھ پڑھ کر بھی۔ لیکن تربیت کی اصل ذمہ داری ایک فرد کی اپنی ہی ہے۔ تربیت کے عمل میں یہ سب سے پہلا اور بنیادی سبق ہے جو ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے۔

ہم جیسا بھی بننا چاہیں' وہ اپنی کوشش سے اور اپنے عمل سے بنیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو بہت واضح اور صاف طور پر بیان فرما دیا ہے کہ آدمی کے حصے میں وہی کچھ آتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِ نْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰیo (النجم ۳۹:۵۳)

اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔

جو آدمی خود کچھ نہ بننا چاہے' وہ دوسروں کے بنانے سے نہیں بن سکتا۔ آدمی اپنی محنت اور کوشش سے ہی اپنے آپ کو وہی کچھ بناتا ہے جو وہ بننا چاہتا ہے۔ لہٰذا تربیت کے ضمن میں بنیادی بات اپنی اِس ذمہ داری کو سمجھنا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى o (الاعلٰی ۸۷:۱۴)

فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی۔

تَزَکّٰی کا لفظ عربی زبان میں جس وزن پر اور جن معنوں میں آیا ہے، اس میں انسان کا اپنے اوپر محنت سے کسی کام کو کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ اسی وزن پر تدبر اور تذکر ہیں۔ تدبر آدمی خود کرتا ہے، کوئی دوسرا زبردستی نہیں کروا سکتا۔ تذکر کے معنی کسی چیز کو یاد کرنے اور یاد رکھنے کے ہیں۔ یہ بھی آدمی خود کرتا ہے، کوئی دوسرا نہیں کروا سکتا۔ چنانچہ تَزَکّٰی سے مراد اہتمام کے ساتھ اپنی کوشش سے اپنا تزکیہ کرنا، اپنے آپ کو برائیوں سے پاک کرنا اور اپنی نشوونما اور ارتقا کی کوشش کرنا ہے جو دراصل آدمی کی اپنی ذمہ داری ہے۔ اسی لیے جہاں تَزَکّٰی کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں یہ بھی فرمایا گیا:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا o (الشمس ۹۱:۹)

یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔

تزکیہ کسی کام کو بتدریج کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس کو پاک صاف کرنے کا کام مسلسل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ جتنے بیرونی محرکات اور تربیت کے ذرائع ہیں، وہ اللہ کی وحی ہو یا اس کی کتاب، یا اس کے رسول علیہم السلام جو اس دنیا میں رہنمائی کے لیے آتے رہے ہیں، یا صالح صحبت جو آدمی کو نصیب ہوتی ہے، یا کتابیں اور لٹریچر ہو، یا درس قرآن اور اجتماعات ہوں، ان سب کی حیثیت معاون و مددگار کی ہے۔ اگر زمین بنجر ہے اور اس میں بیج موجود نہیں ہے تو باہر سے خواہ کتنا ہی پانی دیا جائے، کتنی ہی کھاد ڈالی جائے، کتنی ہی محنت کی جائے، فصل نہیں اگے گی۔ فصل تو اسی وقت اگے گی جب زمین میں فصل اگانے کی صلاحیت موجود ہو اور بیج موجود ہو جو پودے اور درخت کی شکل اختیار کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے لوگ جو نبی کریمؐ کی صحبت میں بیٹھتے تھے، آپؐ کا کلام سنتے تھے، آپؐ کے ساتھ نمازیں پڑھتے تھے، یا آپؐ سے واقف تھے، وہ کافر اور منافق ہی رہے۔ انھیں سچا ایمان لانے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ اگر محض کسی اچھی بات کا سن لینا اور کسی اچھی صحبت میں بیٹھ جانا ہی کافی ہوتا، تو ان میں سے ہر ایک کو ایمان کی دولت نصیب

ہو جاتی‘ لیکن جنھوں نے خود صحیح بات کو نہ ماننا چاہا اور صحیح راستے پر نہ چلنا چاہا‘ ان کے لیے ان میں سے کوئی چیز بھی مددگار ثابت نہ ہوئی اور نہ ہوسکتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ کو مخاطب کر کے فرمایا:

اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ (القصص ۲۸:۵۶)

اے نبیؐ! تم جسے چاہو اُسے ہدایت نہیں دے سکتے۔

یہ اللہ کا قانون ہے اور اس کے تحت ہی وہ لوگوں کو توفیق بخشتا ہے‘ اور توفیق کا انحصار آدمی کے اپنے ارادے اور خواہش پر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر آدمی سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے۔

انسان مجبورِ محض نہیں ہے بلکہ وہ ایک بااختیار ہستی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو انسان پر ایسا کوئی اختیار نہیں دیا ہے کہ وہ اس سے زبردستی کوئی کام کروا سکے۔ اس کو زیادہ سے زیادہ جو اختیار حاصل ہے‘ وہ یہ ہے کہ وہ برائی کا خیال دل میں ڈال دے‘ برائی کو اچھا کر کے دکھائے‘ اس کی ترغیب دے اور آدمی سے کہے کہ یہ برائی کرو۔ لیکن وہ زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر‘ یا اس کی زبان سے کوئی برا کام نہیں کرواسکتا۔ اگر آدمی جھوٹ نہ بولنا چاہے تو وہ اس سے جھوٹ نہیں بلوا سکتا۔ اگر آدمی انتقام اور غصے سے مغلوب ہو کر کسی کی غیبت کرنا یا حسد کی بنا پر کسی کو برا بھلا نہ کہنا چاہے‘ تو شیطان اس سے یہ کام زبردستی نہیں کرواسکتا۔ اسے صرف وسوسے ڈالنے کا اختیار حاصل ہے۔ وہ دل میں خیال ڈال سکتا ہے‘ برائی کی ترغیب دے سکتا ہے۔ لیکن اپنے ہاتھ‘ پاؤں یا زبان سے کسی برائی کا ارتکاب کرنا‘ یہ انسان کا ذاتی فعل ہے۔ وہ اپنی آزاد مرضی سے کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اگر وہ کوئی کام نہ کرنا چاہے تو کوئی اس سے زبردستی نہیں کرواسکتا۔

اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ محض لٹریچر کے مطالعے سے انسان کی تربیت ہوجائے گی اور وہ اچھا انسان بن جائے گا تو یہ بات درست نہیں‘ اگرچہ لٹریچر کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ لیکن تربیت کے لیے صرف لٹریچر کا مطالعہ کافی نہ ہوگا‘ جب تک آدمی اُس پر عمل کرنے کی خود کوشش نہ کرے۔ اسی طرح موثر تقاریر اور تربیت گاہیں اور قرآن مجید کا پڑھنا بھی کافی نہ ہوگا۔ یورپ کے بعض مفکرین نے قرآن کو پڑھنے‘ عربی جاننے اور تفسیریں پڑھنے میں عمر کھپا دی‘ بڑی شان دار کتابیں

بھی لکھیں' لیکن ان کو ایمان کی دولت نصیب نہیں ہوئی اور نہ عمل کی توفیق ہی ملی۔ لہٰذا تربیت کے لیے جو چیز اہم ترین ہے وہ دراصل آدمی کا اپنا ارادہ اور کوشش ہے۔

اگر اپنی اصلاح کا ارادہ ہی نہ ہو تو تربیت گاہیں' دروسِ قرآن' یا لٹریچر' کوئی بھی چیز فائدہ نہیں دے گی۔ اگر ارادہ ہوگا اور اصلاح کی کوشش بھی ہوگی تو قرآن میں سے ہر چیز اسی طرح فائدہ دے گی جس طرح بیج اور زمین کو مناسب پانی ملے' مناسب کھاد اور ادویات میسر آئیں اور مناسب دیکھ بھال ہو تو فصل لہلہا اٹھتی ہے اور کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ البتہ زمین کی زرخیزی و تیاری اور بیج کی فراہمی کسان کا اپنا کام ہے۔ اگر کوئی کسان اپنے کھیت سے غافل ہو اور وہ یہ چاہے کہ محض بارش برس جائے اور اس کی فصل تیار ہو جائے' یا کھاد ڈالنے سے ہی پیداوار حاصل ہو جائے تو یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح یہ سوچنا کہ محض درس وتقریر سننے اور لٹریچر کے مطالعے سے تربیت ہو جائے گی تو یہ بھی خام خیالی ہے۔

لوگ شکایت کرتے ہیں کہ تربیت کی کمی ہے' انحطاط ہے' معیار گر گیا ہے' لٹریچر نہیں پڑھا جاتا' لوگوں کے اندر عملی کمزوریاں ہیں' لہٰذا تربیتی پروگرام زیادہ ہونے چاہییں' تاکہ معیاری افراد تیار ہو سکیں اور صحیح نہج پر تربیت ہو۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ لٹریچر پڑھنا ضروری ہے' قرآن مجید کا مطالعہ بھی ضروری ہے اور تربیت گاہیں بھی ضروری ہیں' لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی مسئلے کا اصل حل نہیں ہے۔ تربیت کی بنیاد تو ایک فرد کی اپنی محنت ہے' اپنا ارداہ ہے اور اپنی کوشش ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ اسی لیے نبی کریمؐ نے فرمایا: کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ مَّسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِیَّتِہٖ ،تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

جو جس کا نگہبان ہے وہ اس کے بارے میں جواب دہ ہے۔ سب سے بڑھ کر تو انسان کا اپنا نفس اور اس کی زندگی ہے جس کے لیے وہ جواب دہ ہے۔ اس وقت کی جواب دہی ہے جو تیزی سے گزرتا چلا جا رہا ہے۔ زندگی ایک نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے اور جو برف کی طرح پگھل رہی ہے اور ہاتھ سے نکلی چلی جا رہی ہے۔ اس کے لیے انسان' خدا کے ہاں جواب دہ ہے۔ سورۃ العصر میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَالْعَصْرِ o اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ o (العصر ۱۰۳:۱-۲)
زمانے کی قسم' انسان درحقیقت خسارے میں ہے۔

وقت کس قدر تیزی سے گزر رہا ہے' اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہر گزرنے والا لمحہ انسان کی عمر گھٹا رہا ہے۔ ہم رات کو سوتے ہیں اور صبح کو اٹھتے ہیں' لیکن ہماری زندگی کا ایک دن کم ہو چکا ہوتا ہے اور وہ کبھی دوبارہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ لہٰذا کامیاب وہ ہے جو زندگی کی قدر جانے اور آنے والے کل کے لیے آج سامان کرلے۔ یہ قدر اسی کو ہوگی جسے جواب دہی کا احساس ہو' جو اپنا تزکیہ کرے' برائیوں کو دبائے اور بھلائیوں کو نشوونما دے' البتہ اس عمل کی بنیاد انسان کا اپنا ارادہ اور کوشش ہے۔

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی (النجم ۵۳:۳۹)
اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔

انسان کی زندگی' اس کی کھیتی' اس کا کاروبار' اس کو بنانا اور سنوارنا' اس میں نیک اعمال کے بیج بونا اور نیک اعمال کی کھیتی اگانا' یہ اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ کسی دوسرے کے کرنے سے یہ نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی نماز نہ پڑھے تو کوئی دوسرا اس کی جگہ نہ نماز پڑھ سکتا ہے اور نہ زبردستی اُسے نماز پڑھوا سکتا ہے۔ اگر نماز میں اللہ کے حضور حاضری اور خشوع وخضوع سے گفتگو کا تصور آدمی خود نہ پیدا کرے تو کسی تقریر اور درس قرآن سے یہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہ تو ممکن ہے کہ نماز بہتر بنانے پر کوئی تقریر سن کر ایک آدھ نماز بہتر پڑھ لی جائے لیکن اس کے بعد پھر توجہ بٹ جاتی ہے' بھول ہوجاتی ہے۔ اس لیے کہ ارادے کی کمزوری' غفلت اور بھول انسان کے مزاج کا حصہ اور فطری امر ہیں۔ البتہ اگر یہ مرض ہے تو اس کی دوا بھی موجود ہے۔ آدمی اس پر قابو پاسکتا ہے لیکن دوا تو استعمال کرنے سے ہی فائدہ دیتی ہے۔ اگر دوا شیشی میں بھر کر اپنے پاس رکھ لی جائے اور یہ وعظ سنا اور کہا جائے کہ یہ دوا بڑی فائدہ مند ہے' تو اس سے مرض دور نہیں ہوگا' بلکہ اس کے لیے دوا استعمال کرنا ہوگی۔ اسی طرح اللہ کی یاد سے غفلت کا علاج ہوجاتا ہے' لیکن اگر اللہ کو یاد ہی نہ کیا جائے تو غفلت کیسے دور ہوسکتی ہے؟ لہٰذا جو کچھ بھی تربیت ہوگی وہ اپنی کوشش سے' اپنی محنت اور اپنے ارادے سے ہوگی نہ کہ محض وعظ ونصیحت یا تربیت گاہ میں شرکت سے۔

ایک فرد کے نزدیک جس چیز کی جتنی قدر و قیمت ہوتی ہے، وہ اس کے لیے اتنی ہی تگ و دو، کوشش اور محنت کرتا ہے۔ وہ اگر کوئی دکاندار ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ میں گھر بیٹھا رہوں، یا دعا کرتا رہوں، یا کسی بزرگ کی برکت ہوگی، یا میں تجارت کے فضائل پر اور دکان میں مال رکھنے کی اہمیت پر کوئی تقریر کروں گا تو اس سے مال فروخت ہوگا۔ دکان تو تب چلے گی جب سودا لایا جائے، دکان میں رکھا جائے، گاہک آئیں اور سودا بیچا جائے، تب نفع ہوگا۔ دکان چلانے اور نفع کمانے کا اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ زندگی بھی ایک دکان اور تجارت کی طرح ہے۔ یہ جنت کو کمانے کی تجارت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ○ (الصف ۶۱:۱۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمھیں عذابِ الیم سے بچا دے؟

یہ تجارت، زندگی کو اللہ کی راہ میں کھپانے، جنت کمانے اور جہنم سے بچنے کی ہے۔ اگر کوئی یہ سوچے کہ یہ تجارت محض خواہش، تمنا اور آرزو سے ہو جائے گی اور نفع حاصل ہو جائے گا، یا محض تقریر یا درس سننے سے ہو جائے گی تو ایسا نہیں ہوگا، بلکہ فصل حاصل کرنے کے لیے جس طرح کھاد اور پانی ضروری ہے، اسی طرح تربیت کے لیے تقریر اور درس قرآن بھی اہم اور ضروری چیزیں ہیں، لیکن اصل کام اپنا ارادہ اور کوشش ہے۔

لہٰذا تربیت کے عمل میں سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ عمر، یہ زندگی، یہ جسم، یہ جان، اگر میں تاجر ہوں تو میری یہ دکان اور کاروبار اور اگر میں کسان ہوں تو میری یہ کھیتی، اس میں جو کچھ پیدا ہوگا، جو فصل اُگے گی، وہ میرے ارادے اور کوشش سے ہی اُگے گی۔

قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ:

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَھَا سَعْیَھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُھُمْ مَّشْکُوْرًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۱۹)

اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے، اور ہو وہ مومن، تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی۔

گویا جس نے یہ ارادہ کرلیا کہ مجھے آخرت کمانا ہے اور اس کے لیے محنت کی جیسا کہ محنت کرنی چاہیے اور ایمان کا بیج موجود ہو اور عمل ہو تو اس کی کوشش کی پوری قدردانی کی جائے گی۔

کون کیا اعمال کرے گا، یا کتنے گناہ اس سے سرزد ہوں گے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ آدمی سے گناہ بھی ہوں گے اور بہت سے نیک کام وہ نہیں کر پائے گا۔ بہت سے درجات تک وہ نہیں پہنچ پائے گا اور بہت سے کام کرنا چاہے لیکن نہیں ہو پائیں گے، لیکن جو نیک کام بھی وہ کرنا چاہے گا اس کا اجر اسے مل کر رہے گا۔

اللہ کو تو بس یہی مطلوب ہے کہ آدمی ارادہ کرے، عزم کرے اور فیصلہ کرے کہ اسے آخرت کمانا ہے، اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے، وہ اعمال اور وہ محنت کرنی ہے جس سے اسے یہ چیز حاصل ہو سکے اور پھر اپنی حد تک کوشش کرے جتنی اللہ نے اسے ہمت اور قوت دی ہے۔ اس سے زیادہ کسی سے مطالبہ نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ یہ بات کہ اپنا کام خود کرنا، اپنی ذمہ داری کو خود سنبھالنا، اپنی کھیتی اور اپنی دکان کی خود فکر کرنا، اس کو تیار کرنے اور چلانے کے لیے پوری محنت اور کوشش کرنا، ہر فرد کی اپنی ذمہ داری ہے۔ کوئی دوسرا یہ ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔ اگر اُس نے اِس راز کو پالیا، تو تربیت کا راستہ اس کے لیے کھل گیا۔

جب تک آدمی اس انتظار میں رہے کہ کچھ بیساکھیاں مل جائیں جن کے سہارے وہ چل سکے، تو ایسا شخص دوسروں کو موردِ الزام ہی ٹھیراتا رہے گا کہ یہ نہیں ہو رہا، وہ نہیں ہو رہا، یا دوسرے ایسا نہیں کر رہے، وہ پروگرام نہیں ہو رہا وغیرہ۔ اس لیے مجھ میں خامی ہے۔ ان میں سے کوئی عذر بھی قابلِ قبول نہیں ہے۔

قرآن میں ہے کہ لوگ روزِ قیامت، اللہ تعالیٰ کے سامنے عذر تراشیں گے کہ یہ تو ہمارے بڑوں سے، آباواجداد سے ہوتا چلا آ رہا تھا، ہم نے تو ان کی پیروی کی، لیکن اللہ تعالیٰ اس عذر کو بھی قبول نہیں کریں گے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ ہمارے سردار تھے، پیشوا تھے، علما تھے، لیڈر تھے ہم تو ان کی وجہ سے گمراہ ہوئے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ اس عذر کو بھی قبول نہیں فرمائیں گے اور ان کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ دراصل ہر آدمی اپنے اعمال کے لیے خود ہی ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ قیامت کے روز شیطان بھی کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا کہ اپنی برائی کے تم خود ذمہ دار ہو۔

میرا کوئی قصور نہیں۔ میرا تم پر کوئی زور نہیں تھا۔ میں نے تو تمھیں محض ترغیب دی تھی، للچایا تھا، برائی کی طرف دعوت دی تھی اور تم نے میری دعوت خود قبول کی تھی۔

اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ط (ابراھیم ۱۴:۲۲)

میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔

گویا اگر تم بگڑ گئے، خرابی کا شکار ہوئے، اچھے انسان نہیں بنے، گناہ گار ٹھیرے تو دوسروں کو موردِ الزام مت ٹھیراؤ، اس کے تم خود ہی ذمہ دار ہو۔

دراصل بنیادی ذمہ داری تو ہر شخص کی اپنی ہی ہے۔ ہر آدمی اللہ کے سامنے اکیلا حاضر ہوگا، اور وہ اکیلا ہی اپنے عمل کی جواب دہی کرے گا۔ اگر کوئی مجبور ہوگا، یا معقول عذر ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے گا۔ البتہ کسی دوسرے پر الزام لگا کر اپنی ذمہ داری سے بری نہیں ہوا جاسکتا۔ یہ بات بالکل واضح ہے اور جو آدمی اس بنیادی اصول سے ہی واقف نہ ہو، وہ صحیح معنوں میں اپنی تربیت نہیں کرسکتا۔

تربیت اپنے بس میں ھے!

دوسرا اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بھی انسان کو اس سے زیادہ مکلّف نہیں بنایا، یا ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جتنی اس کی استطاعت ہو۔ اس نے انسان پر ایسا کوئی بوجھ نہیں ڈالا جو وہ نہ اٹھا سکتا ہو۔

لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ ۲:۲۸۶)

اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔

ہر ایک کے لیے اُس کے اچھے اور بُرے عمل کے مطابق ہی بدلہ ہے۔ گویا اگر ایک

طرف خوشخبری ہے تو دوسری طرف بڑی سخت گرفت اور پکڑ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے مجھے کچھ کرنے کا جو موقع دیا ہے، اس کا میں خود ذمہ دار ہوں، اور جس برائی کا میں مرتکب ہوا، اس کا بھی میں خود ہی ذمہ دار ہوں گا کوئی دوسرا ذمہ دار نہیں ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۲)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔

اس پر صحابہ کرامؓ کانپ اٹھے اور لرز کر رہ گئے کہ کون ہے جو اللہ سے ویسا ہی تقویٰ اختیار کرے جیسا کہ اس کا حق ہے۔ اللہ سے تقویٰ کرنے کا تو کوئی حق ادا نہیں کر سکتا۔ پھر جب یہ آیت نازل ہوئی:

فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن ۶۴:۱۶)

جہاں تک تمھارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔

یعنی جتنی تمھاری استطاعت ہے اتنا اللہ سے تقویٰ اختیار کرو تو انھیں اطمینان ہوا اور ان کی جان میں جان آئی۔ لہٰذا کون کیا کر سکتا ہے، یا اسے کیا کرنا چاہیے، اس حوالے سے بہت زیادہ سوچنے یا کسی ذہنی الجھن کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ آدمی جس قدر بھرپور محنت کر سکتا ہے وہ کرنی چاہیے۔ اگر غلطی ہو جائے یا گناہ سرزد ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے استغفار کرنا چاہیے اور پھر اس کی اطاعت و فرماں برداری کی راہ پر لگ جانا چاہیے۔ اسلام میں مایوسی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کسی پر اُس کی ہمت و استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اگر کوئی شخص کوئی کام نہیں کر سکے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ کوئی مواخذہ نہیں کرے گا لیکن یہ بات خوب سوچ سمجھ کر کہنی چاہیے کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا، یا اس ذمہ داری کو نہیں اٹھا سکتا۔ اس لیے کہ یہ بات، یا یہ عذر کسی ناظم، امیر، ذمہ دار، دوست یا محض اجتماع میں نہیں رکھنا ہے، بلکہ اس کے سامنے پیش کرنا ہے جو انسان کے اندر اور باہر سے خوب واقف ہے۔ لہٰذا اس موقع پر محض یہ نہ خیال کیا جائے کہ میں

اپنے جیسے انسانوں کو مطمئن کر رہا ہوں، بلکہ یہ سوچا جائے کہ ہم اس ذات کو جواب دہ ہیں جو دلوں کا حال جانتا ہے، جو سب سے واقف ہے، جو بخوبی جانتا ہے کہ کون کیا کرسکتا ہے اور کیا نہیں کرسکتا۔ لہٰذا محض یہ کہنا کہ میں یہ کام نہیں کرسکتا، یا وقت نہیں ملتا، یہ عذر بھی قابل قبول نہیں ہے۔

اللہ نے ہر ایک پر وہی ذمہ داری ڈالی ہے جو وہ اٹھا سکتا ہے۔ اس لیے اس نے ہر مسلمان پر جو فرائض عائد کیے ہیں، وہ کسی انسان کے بس سے باہر نہیں۔ اگر کوئی معاملہ اس کے بس میں نہ ہو تو شریعت میں اس کے لیے چھوٹ موجود ہے۔ اگر کوئی آدمی بے ہوش ہو جائے تو نماز کا کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ کوئی بیمار ہو جائے تو کھڑے ہو کر پڑھنے کی کوئی ذمہ داری اس پر نہیں ہے، اگر پانی نہ ملے تو تیمّم کر کے پڑھے۔ اگر کوئی پاگل ہے تو اس سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ غرض جہاں بھی کوئی کام کسی کے بس میں نہ ہو تو شریعت اس کے لیے راستہ کھول دیتی ہے، اور جو ممکن ہے، اختیار سے باہر نہیں، اس کے لیے کوئی عذر قابلِ قبول نہیں۔

ہر آدمی نماز پڑھ سکتا ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ فجر میں میری آنکھ نہیں کھلتی تو یہ بھی کوئی معقول عذر نہیں۔ ہر آدمی اچھی طرح جانتا ہے کہ اگر کوئی مجبوری آن پڑے یا ہوائی جہاز یا ٹرین میں سفر کرنا ہو تو آنکھ ضرور کھل جاتی ہے۔ اگر کوئی حادثہ پیش آجائے، یا بچہ بیمار ہو جائے تو رات بھر آنکھ نہیں لگتی۔ لہٰذا اللہ کے ہاں تو کوئی ایسا عذر پیش نہیں کیا جاسکتا جو معقول نہ ہو۔ اصل بات یہ جان لینا ہے کہ جو کام بھی اللہ نے مجھے کرنے کو کہا ہے، یہ بالکل میرے بس میں ہے، میرے اختیار میں ہے، اور جو کام میرے اختیار میں نہیں ہیں، ان کے لیے کوئی مطالبہ بھی نہیں ہے۔

نماز پڑھنا آدمی کے اختیار میں ہے، اللہ تعالیٰ سوال کرے گا کہ تم نے نماز کیوں نہیں پڑھی۔ نماز کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا یہ ہے کہ نماز کے اندر خشوع ہو، اور اس کے لیے کوشش کرنا بندے کے اختیار میں ہے۔ لہٰذا وہ یہ پوچھے گا کہ تم نے نماز میں خشوع پیدا کرنے اور اس کو بہتر بنانے کے لیے کیا کوشش کی، لیکن نماز میں کتنا خشوع پیدا ہوگا یہ بندے کے بس میں نہیں ہے۔ آدمی کا دل کبھی اس کے اختیار میں ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ کئی قسم کے خیالات اور وسوسے دل کو غافل کر دیتے ہیں۔ دل پر انسان کو مکمل اختیار نہیں دیا گیا۔ اپنے آپ کو متوجہ رکھنا تو انسان کے اختیار میں ہے لیکن دل کی کیفیت ایک سی رہے، یہ ہمارے بس میں نہیں ہے۔ لہٰذا جو

کام آدمی کے بس میں ہو وہ کام کرنا اس کی ذمہ داری ہے، اور وہ اس کا مکلّف ہے۔

اسی طرح ایک داعی کی حیثیت سے دوسروں تک بات پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے اور اس کے لیے حتی المقدور کوشش کرنا، ذرائع و وسائل اختیار کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن یہ بات سوچنا کہ اس سب کے باوجود لوگ لازماً ہماری بات مان لیں تو اس کے ہم ذمہ دار نہیں ٹھیرائے گئے۔ البتہ اپنی بیوی بچوں کو نیکی کی تلقین کرنا اور ترغیب دینا، اپنے دوستوں کو نیکی کی دعوت دینا، یہ تو ہمارے اختیار میں ہے اور اس کے لیے ہم سے پرسش ہوگی، مواخذہ ہوگا۔ اس کے بعد اگر کوئی بات نہ مانے اور لوگ نہ سنیں، یا سنی ان سنی کر دیں تو اس پر کوئی جواب دہی نہیں ہے۔ اگر کوئی ہماری بات نہ مانے تو اس پر ہمارے اجر میں کوئی کمی نہ ہوگی اور نہ کوئی مواخذہ ہوگا۔ اصل بات جو ہمارے اختیار اور ہمارے بس میں ہے، وہ ہے کام کرنا، یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ یہ دوسرا بڑا اہم اصول ہے جو تربیت کے ضمن میں ہمیشہ سامنے رہنا چاہیے۔

تربیت، عمل سے

تیسرا اصول یہ ہے کہ تربیت عمل سے ہوتی ہے۔

کوئی کام خواہ کتنا ہی چھوٹا یا معمولی ہو، وہ کرنا چاہیے، چاہے تھوڑا ہی کیا جائے۔ اگر ہمارے عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، کوئی نیا عمل نہیں شروع کیا، کسی پرانے عمل کو بہتر نہیں بنایا، کسی برائی کو نہیں چھوڑا، تو اس سے ایک فرد کی تربیت میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔

عمل خواہ تھوڑا کیا جائے لیکن باقاعدگی سے کیا جائے، یہی تربیت کی بنیاد ہے۔ ضروری ہے کہ کچھ وقت نکال کر ہم اپنا جائزہ لیں۔ اپنی پوری زندگی پر ایک نظر ڈالیں۔ آپ ۱۵ سال کے ہوں یا ۶۰ سال کے، آپ کے سامنے اپنی پوری زندگی موجود ہے۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌO (القیمة ۷۵:۱۴)

انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے۔

یعنی ہر انسان خود اپنے آپ سے بخوبی واقف ہے۔ کسی کو باہر سے وعظ و نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر یہ دیکھیے کہ اللہ کے حقوق و معاملات اور اللہ کے بندوں کے معاملات میں آپ نے کیا کیا خرابیاں کی ہیں۔ اس کے بعد استغفار کیجیے اور گناہوں سے توبہ کیجیے، اور کوشش کر کے غلط باتوں کو ترک کر دیجیے اور اچھی باتوں کو اپنا لیجیے۔

اگر آپ فجر کی نماز مسجد میں جا کر باجماعت اور باقاعدگی سے نہیں پڑھتے تو آپ یہ فیصلہ کریں کہ میں کل سے یہ کام کروں گا۔ ممکن ہے کئی دن ایسے آئیں کہ آپ یہ کام نہ کر سکیں۔ لیکن جس دن نہ کر سکیں، اسی دن پھر استغفار کریں اور نئے سرے سے عزم کریں کہ اب کروں گا۔ اگر سو بار بھی یہ نوبت آ جائے تو کوئی پروا نہیں۔ آپ پیچھے پڑے رہیں کہ مجھے اس کام کو کر کے ہی چھوڑنا ہے، تو یہ کام ہو جائے گا۔

نماز میں آپ نیت باندھتے ہیں اور نیت باندھ کر خیالوں ہی خیالوں میں کہیں اور چلے جاتے ہیں اور یہ خیال ہی نہیں آتا کہ میں کس کے سامنے کھڑا ہوں، اور کس سے بات کر رہا ہوں، اور نماز کی صورت میں اللہ نے مجھے جو کچھ عطا کیا ہے وہ کیا ہے۔ حالانکہ اللہ نے آپ کی تربیت کے لیے، پانچ وقت کی نماز کی صورت میں، ایک ایسا نسخہ آپ کے ہاتھ میں تھما دیا ہے، اگر آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو جائیں اور وہ ساری چیزیں آپ دوبارہ تازہ کر لیں جو آپ نماز میں پڑھتے اور کہتے ہیں، تو یہی تربیت کے لیے کافی ہے۔ حدیث میں ہے کہ اگر کسی آدمی کے دروازے پر نہر بہ رہی ہو اور وہ پانچ وقت اس میں غسل کرے تو کیا اس کے جسم پر کوئی میل کچیل باقی رہے گا؟ کیا وہ پاک صاف نہیں ہو جائے گا؟ لیکن ہم جیسے اس نہر میں جاتے ہیں ویسے ہی اس سے واپس آ جاتے ہیں۔ وہ ساری گندگیاں جو دل و دماغ کو یا روح اور اخلاق کو آلودہ کیے ہوئے ہیں، ویسی کی ویسی ہی واپس آ جاتی ہیں۔

نماز اس طرح پڑھیے گویا اللہ تعالیٰ سے بات چیت ہو رہی ہو اور یہ آخری نماز ہو۔ یہ بھی طے کر لیجیے کہ نماز میں جو کچھ پڑھوں گا، سمجھ کر پڑھوں گا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور دل میں ترجمہ بھی کرتا رہوں گا۔ اگر آپ اس کی مشق کریں اور عادت ڈالیں کہ جو کلمات عربی میں زبان سے نکلیں، دل ہی دل میں اور جی ہی جی میں اس کا ترجمہ کر لیں، یعنی زبان سے تو کہیے الحمدللہ رب العالمین، لیکن دل میں کہیے کہ ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

اس سے آپ کی توجہ اِدھر اُدھر نہ بھٹکے گی۔ اس میں بھی شیطان نقب لگائے گا، چوری کرے گا، ڈاکا ڈالے گا، ذہن میں بار بار مختلف خیال لائے گا، ہر بھولی بسری چیز یاد دلائے گا۔ آپ توجہ سے اس مشق اور کوشش میں لگے رہیں گے تو بالآخر کامیاب ہوں گے۔ خشوع وخضوع کی کیفیت بڑھے گی اور شیطان پسپائی پر مجبور ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر جھوٹ بولا اور وعدہ خلافی کی ہے، یا کسی کا حق مارا ہوا ہے، تو ان سب کی اصلاح کی کوشش کریں۔ غرض آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، اس کا آغاز کردیں، اس لیے کہ عمل سے ہی تربیت ہوتی ہے۔

اگر آپ پہلوان بننا چاہتے ہیں تو آپ کو آہستہ آہستہ ورزش کرنا پڑتی ہے۔ جسم ورزش کا عادی ہوجاتا ہے۔ ریاضت اور مجاہدہ اسی کا نام ہے۔ کوئی چیز آپ سیکھنا چاہتے ہیں یا تقریر کرنا چاہتے ہیں تو آپ آہستہ آہستہ بولنا شروع کریں گے تو تقریر کرنا آئے گی۔ اگر آپ لکھنا چاہتے ہیں تو لکھنا شروع کریں گے تو تھوڑا بہت لکھنا آئے گا۔ اچانک نہیں لکھنا شروع کردیں گے۔ یہی معاملہ ایمان اور روح کی تربیت اور تزکیے کا ہے۔ آہستہ آہستہ آپ سیکھنا شروع کریں گے، عمل شروع کریں گے، عادت پڑے گی، مشق ہوگی اور اس طرح تربیت ہوتی چلی جائے گی۔

ماحول سے سیکھنا

تربیت کا ایک ذریعہ اپنے ماحول سے سیکھنا، ایک دوسرے سے سیکھنا اور ایک دوسرے کی تربیت کرنا ہے۔ یہ بھی ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے۔

انسان جس ماحول میں رہتا ہے وہاں بعض باتیں اچھی لگتی ہیں، دل کو بھاتی اور موہ لیتی ہیں اور بعض باتیں ناگوار اور باعث اذیت۔ ایسے لوگ ملتے ہیں جو اچھے ہوتے ہیں اور ایسے لوگ بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو اچھے نہیں ہوتے۔ ان میں سے کسی سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ درگزر کریں اور معافی کا رویہ اختیار کریں۔ کسی کی خرابی دیکھیں، اگر ممکن ہو تو اس کو خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ بتادیں، توجہ دلائیں اور اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اس کو پھیلاتے نہ پھریں۔ کسی ایک فرد کے اندر خرابی دیکھ کر مجموعی رائے نہ بنالیں اور یہ فتویٰ صادر نہ کردیں کہ یہاں تو سب لوگ ایسے ہی ہیں۔

ہر جگہ' ہر بستی میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ کوئی انسان کسی پہلو سے مثالی نہیں ہوتا۔ انسان خیر و شر کا پتلا ہے۔ کسی انسان کی زندگی اس پہلو سے خالی نہیں ہوتی۔ اگر ہم اپنی زندگی کا جائزہ لیں تو اس میں اچھائیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی۔ ہر انسانی بستی ایسی ہی ہوتی ہے' اچھی باتیں بھی ہوتی ہیں اور بری باتیں بھی۔ ہمیں اچھی باتوں سے اثر قبول کرنا چاہیے اور بری باتوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ جو باتیں آپ کو بری لگتی ہیں کم از کم خود ان کا ارتکاب نہ کریں۔ یہ بھی تربیت کا ذریعہ ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ماحول اور گرد و نواح میں پائے جانے والے لوگ کس طرح آپ کی تربیت کرتے چلے جاتے ہیں۔

یہ چند بنیادی اصول ہیں اس کے علاوہ مزید دو اہم باتیں تربیت میں اپنی جگہ بہت اہمیت کی حامل ہیں۔

عمل کی بنیاد اخلاص

اعمال تو بہت سارے ہو سکتے ہیں لیکن جتنا آپ کر سکیں' اس کو غنیمت سمجھیے۔ اللہ نے جتنی توفیق دی ہے' اس پر اس کا شکر ادا کیجیے۔ آپ کو سب سے بڑھ کر فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ جو عمل بھی کریں' صرف اللہ کے لیے ہو۔ اصل میں یہ اخلاص ہی ہے جس سے اعمال میں اللہ کا رنگ پیدا ہوتا ہے' وزن پیدا ہوتا ہے اور اعمال کا زندگی پر اثر پڑتا ہے۔

وَمَا أُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ (البینۃ ۹۸:۵)

یعنی اللہ نے جس چیز کا حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کی بندگی کریں' اس کے لیے دین کو خالص کر کے اور اس کے لیے یکسو ہو کر۔

گویا اپنا قبلہ' اپنا محبوب اور مطلوب صرف اللہ کو بنایا جائے۔ ہر عمل اس کے لیے ہو۔ اگر ہم نماز پڑھیں تو اس کے لیے' تجارت یا نوکری کریں تو اس کے لیے' اجتماع کریں تو اس کے لیے' دعوت کا کام کریں تو صرف اس کے لیے۔ جتنا آپ اس پہلو کو سامنے رکھیں گے' اور اس میں اخلاص پیدا کریں گے' اتنا ہی آپ کے اعمال' اللہ کے ہاں وزنی قرار پائیں گے اور قبول ہوں گے' اور جتنا آپ اس کے بغیر عمل کریں گے اُسی قدر ہی اعمال بے وزن اور خیر و برکت سے محروم

ہوں گے۔ عمل اگر اللہ کے لیے خالص نہیں ہے تو خواہ نماز ہو یا تعلیم قرآن یا انفاق' حتیٰ کہ آدمی جان بھی قربان کر دے' لیکن یہ اعمال اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوں گے۔ لہٰذا جو اعمال لوگ دکھاوے کے لیے کرتے ہیں وہ قبول نہیں ہوتے۔ اللہ کے ہاں صرف وہی عمل قبول ہوگا جو خالص اُسی کے لیے ہو۔

بظاہر یہ معمولی سی بات ہے کہ ہر کام کو کرتے ہوئے' اپنے ذہن میں اس بات کو تازہ کر لیا جائے کہ میں یہ کام اللہ کے لیے کر رہا ہوں لیکن اس سے اخلاصِ نیت مستحضر ہو جاتا ہے۔ کسی سے نیکی کریں یا احسان' کسی کو ہدیہ کریں' بیوی کے ساتھ اچھی بات کریں یا بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں' ان کی تربیت کریں' غرض جو کام بھی کریں اس میں اس پہلو کو' اگر پیش نظر رکھیں گے تو وہ آپ کے لیے باعث اجر وثواب ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے کہ آدمی جو لقمہ اپنے منہ میں رکھتا ہے وہ بھی صدقہ ہے اور جو اپنی بیوی بچوں پر خرچ کرتا ہے وہ بھی صدقہ ہے' اور آدمی اپنی بیوی کے ساتھ ازدواجی تعلق قائم کرتا ہے اس پر بھی اجر ملے گا۔ صحابہؓ کو اس پر تعجب ہوا کہ یہ کیسے ہوگا کہ ایسا دنیاوی کام اور اس پر بھی اجر ملے گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص غلط طریقے سے اپنی جنسی خواہش پوری کرے گا تو کیا اس کو عذاب نہیں ہوگا؟ صحابہؓ نے کہا کہ ہاں ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا اور اگر وہ صحیح طریقے سے اس خواہش کی تکمیل کرے تو کیا اسے اجر نہیں ملنا چاہیے؟

اس طرح ہم جو بھی کام کریں' اللہ کو خوش کرنے کے لیے کریں تو پوری زندگی عبادت بن جائے گی اور ہر کام نیکی تصور ہوگا۔ یہ سب خلوص نیت اور اخلاص کا نتیجہ ہوگا۔

حقوق اور معاملات پر نظر

دوسری بات حقوق العباد سے متعلق ہے۔

اسلام میں بندوں کے حقوق اور بندوں کے معاملات کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اللہ نے ہر انسان کی جان' اس کا مال اور اس کی عزت' تینوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ہم میں سے شاید ہی کوئی ہوگا جو کسی کی جان لینا چاہے گا' لیکن مال کے معاملے میں لوگ بڑے بے احتیاط

ہوتے ہیں۔ کسی کی مرضی کے بغیر اس کا مال لینا' حرام ہے۔ کسی کا حق مار لینا یہ اس سے بھی بڑا حرام کام ہے اور یہ ایسا جرم ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہے' الا یہ کہ اس کا بدلہ دیا جائے۔ شراب پی' تو یہ ایسا گناہ ہے کہ اللہ' استغفار سے شاید معاف کر دے لیکن اگر کسی کا حق مار لیا' کسی کا مال ناجائز طور پر کھا لیا' تو جب تک اس کا بدلہ نہ دے دیا جائے' اس کو معاف نہ کروائیں' کوئی معافی نہیں ہے۔ ہم لوگ سور کا گوشت نہیں کھاتے کہ حرام ہے۔ حالانکہ سور کا گوشت اگر کھالیں تو شاید اللہ تعالیٰ استغفار سے معاف فرما دے۔ اس لیے کہ آپ نے صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچایا ہے اور اللہ کے حکم کی نافرمانی کی ہے۔ لیکن اگر آپ نے کسی کی عزت پر حملہ کیا' کسی کی غیبت کی' کسی کو گالی دی' کسی کا تمسخر اڑایا' کسی کو قتل کر دیا' تو یہ اس سے بڑے گناہ ہیں جتنا کہ سور کا گوشت کھانا۔ یہ وہ حرام کام ہیں کہ جن میں اگر آپ ملوث ہوں' تو جب تک آپ متاثرہ فریق سے معاف نہ کروالیں' یا آپ اللہ کو اس قدر محبوب ہوں کہ وہ آپ کی طرف سے کچھ دے دلا کر اس بندے کو راضی کر لے' تو وہ الگ معاملہ ہے (کیا اتنے نیک ہیں ہم!) ورنہ قاعدہ اور اصول تو یہی ہے کہ یا تو آپ اس کو معاف کروائیں یا پھر قصاص دیں' اس کا بدلہ دیں۔

بندوں کے حقوق اور معاملات کی جب اس قدر اہمیت ہے تو پھر اس کا ناگزیر تقاضا ہے کہ ہم کسی کو ایذا نہ پہنچائیں' تکلیف نہ دیں۔ بیوی بچے ہوں یا دوست احباب' یا کوئی اور شخص جو ساتھ آ کر بیٹھ جائے' ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ کسی کو بھی ہم سے تکلیف نہ پہنچے۔ ایک پڑوسی تو وہ ہے جس کا دروازہ ہمارے گھر کے دروازے کے ساتھ ملا ہوا ہے' ایک پڑوسی وہ ہے جو ہمارا رشتے دار بھی ہے' لیکن ایک پڑوسی وہ ہے جو پہلو میں آ کر چند لمحوں کے لیے بیٹھ جائے۔ ہر پڑوسی کا ہم پر حق ہے۔ جو ساتھ بیٹھا ہوا ہے اس کا بھی حق ہے' جو کمرے میں ساتھ رہتا ہے اس کا بھی آپ پر حق ہے' اور ان سب حقوق کا قرآن مجید میں ذکر موجود ہے۔ بیوی بچے بھی پڑوسی ہیں' ایک لحاظ سے ان کا بھی حق ہے۔ لہٰذا بندوں کے یہ حقوق کہ ہم کسی کو ایذا نہ پہنچائیں' کسی کا حق نہ ماریں' کسی کی عزت پر حملہ نہ کریں' زبان کو پاک صاف رکھیں' بُرے انداز میں کسی کا ذکر نہ کریں' کسی کا مذاق نہ اڑائیں' کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے کسی کو تکلیف پہنچے' دل آزاری ہو' جذبات کو ٹھیس پہنچے وغیرہ وغیرہ' ہماری خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔

یہ دو بڑی اہم باتیں ہیں کہ اللہ کی مرضی و خوشنودی کے لیے کام کرنا' اور بندوں کا حق نہ مارنا اور ان کو تکلیف نہ پہنچانا۔ انھی دو اصولوں کی بنیاد پر آپ عمل کرتے جائیں تو ان شاء اللہ آپ کو اپنی تربیت کے لیے بڑی مدد ملے گی۔

تربیت کے ضمن میں یہ چند بنیادی باتیں ہیں۔ ہم انھیں یاد رکھیں اور یہ اہم ترین اصول ہمیشہ پیش نظر رہے کہ ہر فرد اپنی تربیت کا خود ہی ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ درس قرآن' تقاریر' تربیت گاہیں' دوست احباب' مطالعہ لٹریچر' گردونواح کا ماحول اور افراد تب ہی معاون و مددگار اور مؤثر ہوں گے جب ہم ارادہ اور عزم مصمم کرلیں کہ ہمیں اپنی تربیت آپ کرنا ہے' اور پھر اس کے لیے عمل شروع کردیں خواہ وہ کتنا ہی معمولی ہو لیکن ہو مسلسل۔ یہی تربیت کی بنیاد ہے۔

(کیسٹ سے تدوین: امجد عباسی)